

قرآن کا تصور انسان

• ایس احمد استاد شعبہ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی

دور جدید کے ایک نامور مفکر نے آج کی دنیا کا جائزہ لے کر بہت خوب کہا تھا کہ ”ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا لیکن زمین پر اچھے انسانوں کی طرح رہنا نہ سیکھ سکے“

آج کے انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ذرائع و وسائل کی دنیا میں تو اس نے عمیر العقول ترقی کر لی ہے، لیکن فکر و اخلاق کے میدان میں زندگی کی شاہراہ اس کے سامنے صاف اور واضح صورت میں آج بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی فکر پر گندہ اور سماجی تعلقات نت نئی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہیں اس کی روح مضطرب ہے اور وہ ایک بہتر دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ اپنی عقل کو رہنا بنانے نئے نئے سوالات کے حل تلاش کرنے اور بگاڑ کی اصل تک پہنچنے میں لگا ہوا ہے۔ ان حالات میں غور و فکر کا ایک یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آج کی دنیا کے سامنے انسان کا جو تصور ہے کہیں وہی خام نہ ہو۔ ظاہر ہے ایک غلط تصور انسان پر تہذیب و تمدن کی جو بھی عمارت تعمیر ہوگی، وہ کتنی ہی ٹھک بوس کیوں نہ ہو اس کی بنیاد کی خالی اسے متاثر و مجرد کرے گی۔

زیر نظر مقالے میں قرآن کے تصور انسان کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس تصور انسان کے آئینہ میں دور جدید کے انسان کے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جاسکے جو اس کو پریشان و سرگرداں کئے ہوئے ہیں۔

قرآن وہ واحد کتاب ہے، جس کا خطاب انسان اور انسانیت سے ہے اور جسے نازل کرنے والا کوئی گوشت پوست اور محدود عقل کا انسان نہیں ہے بلکہ ایک ”عقل کل“ ایک ”قادر مطلق“ اور ایک ”علیم خبیر“ ہستی ہے۔

یہ صحیفہ الہی جس بستی کو مخاطب کرتا اور اس کی ہر آیت اور ہر نشانی جس ذی روح کو مخاطب کرتی ہے اور اس کے ضوابط و حدود جس مقصد کو سامنے رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں، وہ صرف انسان اور انسانیت ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے کسی موقع پر بھی فرد کو اپنا مخاطب نہیں قرار دیا بلکہ ہمیشہ ”انسان“ ”انسانیت“ اور ”گروہ ابن آدم“ کو اپنا مخاطب گردانا ہے۔

قرآن عہد حاضر کی وہ اولین کتاب ہے، جس نے انسان کے بارے میں ایک واضح اور متعین نقطہ نظر پیش کیا ہے جس نے ان مابعد الطبیعیاتی مسائل پر حتمی اور قطعی فیصلے کئے ہیں، جو مدت ہائے واز سے فکر انسانی میں ایک غلبان برپا کئے ہوئے تھے اور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر ایسے حتمی فیصلے وہ ذات ہی کر سکتی تھی، جو زمان و مکان کی خالق جو۔ چنانچہ قرآن پاک نے سب سے پہلے انسان کی اصل اور حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر دنیا میں انسان کی حیثیت، کائنات میں اس کے مقام اور مقصد اور ان اختیارات و فرائض کو متعین فرمایا ہے جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں۔

انسان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟۔ یہ سوال ایک مدت سے مفکرین کا موضوع بنا رہا ہے۔ دورِ جہٹ کے مفکرین مثلاً لامارک ڈارون، ٹی ایچ ہکسلے، ہنری برگساں اور لائیڈ مارگن وغیرہ نے تصور ارتقا کی مدد سے انسان کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی اور بعد از تلاش بسیار یہ کہہ سکے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جو تجرباتی ٹھوکروں طبیعیاتی انقلابوں، نباتاتی تبدیلیوں اور بعض حادثوں کے سبب وجود میں آیا ہے۔ جس انسان کے آباء و اجداد چوپائے، اُچھلنے کو دینے والے جانور اور زندے ہوں، وہ اپنے ماضی سے کیا رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور اس سے انسانیت کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ قرآن نے اس کے مقابلے میں انسان کے ایک مستقل اور آزاد وجود کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ انسان کو ایک حادثہ کی پیداوار نہیں قرار دیتا، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے اور ایک مقرر عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے چنانچہ:-

”جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی مٹری ہوئی کچھڑ سے خمیر کی ہوئی کھن کھن بونے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں.....“ (۱۵ - ۲۸)

”کیا ہم نے تمہیں ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ قرار گاہ میں رکھا ایک مقررہ وقت تک، پھر ہم نے اندازہ ٹھہرایا۔ سو ہم کیا اچھا اندازہ کرنے والے ہیں“ (۷۷ - ۷۰)

”جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں“ (البقرہ - ۳۰)

ان آیات قرآنی سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ (۱) تخلیق انسان ایک حادثاتی امر نہیں ہے۔

۲: تخلیق انسان ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئی ہے (۲ - ۳)

۳: انسان ایک مستقل اور آزاد وجود کا مالک ہے۔ یہ کسی ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے انسان کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے: "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی۔

پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو" (اعراف - ۱۱)

"تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر جب اسے پوری طرح تیار کروں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا" (ص - رکوع ۵)

انسانی جسم میں روح کا پھونکا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محض ایک مادی وجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ پھر یہ کہ روزِ اول سے انسان کا ایک آزاد وجود ہے۔ وہ نہ تو محض حیوانِ ناطق ہے اور نہ ہی کوئی تمدن جانور، بلکہ ابتدا ہی سے ایک آزاد مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے عقل و شعور بناتائی نشو و ارتقا سے اکتساب نہیں کی ہے بلکہ روزِ اول سے ہی اسے عقل و شعور اور ارادہ کی قوت سے نوازا گیا ہے جس کے ساتھ ہی اس پر بعض اخلاقی ذمہ داریاں بھی مائد کی گئی ہیں۔

انسان کے وجود کے بارے میں ایک مثبت اور واضح تصور دینے کے بعد قرآن دنیا میں انسان کی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ تخلیقِ آدم سے قبل اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتا ہے:-

"وَاذْ قَالِ رَبِّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" (البقرہ - ۳۰)

(ترجمہ) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ گویا دنیا میں اللہ کے اس خلیفہ کی حیثیت کسی ادنیٰ مخلوق یا کائنات کے ایک ناقابلِ انتفاع جزو کی نہ تھی بلکہ اسے کائنات کے مرکز و محور ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ کائنات کے کسی تغیر و تبدل سے وجود میں نہیں آیا بلکہ کُل کائنات کو اس کے لئے پیدا کیا گیا۔ چنانچہ تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں کا حضرت آدم کو سجدہ کرنا گویا علاماتی حیثیت سے پوری انسانیت کو سجدہ کرنا تھا۔ قرآن انسان کی مرکزیت اور بندگی کو ان الفاظ میں تسلیم کرتا ہے:-

” و سخر كمر الليل والنهار والشمس والقمر والنجوم “ اس نے تمہاری بھلائی

کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں..... وہی جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ۔ اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار ہو۔

یہاں پر قرآن نے بنیادی طور پر اس نظریہ کا ابطال کیا ہے کہ انسان اس کائنات کا ایک ساختہ ہے۔ اس کے برعکس قرآن ایک مثبت تصویر پیش کرتا ہے کہ انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور کائنات کی ہر شے اس کے لئے مسخر یعنی معادن کر دی گئی ہے۔ تمام قوانین فطرت کو اس امداد کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ انسانی فکر کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے عظمت آدم اور تفوق انسانیت کے تصورات انسان کو وہ بلندی اور اہمیت دینے میں ناکام ہو چکے ہیں جو قرآن مجید نے اس کو عطا کیا ہے۔

(۲)

انسان کی اس عظمت اور بلندی کا مقصد کیا ہے۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے جسے قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ تمام عظمت و بلندی صرف اس لئے ہے کہ انسان شکر گزار بنے، اس کے مقابلے میں انسان کی روش یہ رہی ہے کہ اس اہمیت اور بلندی نے اسے اپنے بارے میں سخت غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ اس نے جب قوانین فطرت کو اپنے ساتھ تعاون کرتے اور فطرت کی عظیم قوتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا، تو یکایک اپنے اندر اہمیت کی صفات محسوس کرنے لگا۔ قرآن اس روش کو ناشر گزاری سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کے اس طرز عمل کو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو، بنی اسرائیل - ۱۱، ابراہیم - ۲۴، بنی اسرائیل - ۶۷، ۱۰۲، السجدہ - ۴۹، الشوریٰ - ۴۸، اعراف - ۱۹، طہ - ۱۵، فجر - ۱۵، بلد - ۱، عادیات - ۶، حج - ۶۶، روم - ۲۲، سجدہ - ۷، زمر - ۱۰۸، اعراف - ۱۹، روم - ۲۶، السجدہ - ۴۹۔

قرآن نہ تو انسان کو حقیر و ذلیل کر کے پیش کرتا ہے اور نہ اسے اپنی اہمیت کے دھوکے میں

بتلا ہونے دیتا ہے۔ وہ پہلے انسان کو اس کی حقیقت کا احساس ان الفاظ میں دلاتا ہے کہ۔
 ” بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل
 تذکرہ نہ تھا۔ (الدھر - ۱)

اور پھر انسان کو ایک منصبِ عظیم یعنی ”خلاف فی الارض پیمانہ“ کرتا ہے۔ گویا قرآن انسان کو اول ان
 غلط اور خود ساختہ بندیوں سے آوار کر اس کی حقیقت اس پر آشکار کرتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ انسان
 کو حقیقی بندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں ارتقا کی سمت کم تر سے بلند تر کی طرف ہے۔ یہی تصور ارتقا
 انسان کو کسی احساس کمتری میں مبتلا کرے بغیر عظمتِ آدم کا صحیح تصور دیتا ہے۔

انسان کو مرکز کائنات بنانے کے بعد ضروری تھا کہ انسان کو حق و باطل میں تمیز کرنے اور فیصلہ کرنے کا
 حکم بھی دیا جائے۔ یہ حکم کسی تجربہ کی صورت یا کسی مسلسل عمل کے نتیجہ میں ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ تخلیقِ آدم کے ساتھ
 ہی انسان کو دے دیا گیا۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے ”و علم آدم الاسماء کلھا“ یعنی اس کے
 بعد اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے۔ یہ وہ خصوصیت تھی جو انسان کو فرشتوں پر فوقیت عطا
 کرتی ہے اور یہی علم کی صفت انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن انسان کو صرف علم دینا کافی
 نہ تھا۔ علم محض کبھی بھی عمل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عمل کی اصلاح کے لئے قرآن نے انسان کو ایک
 طرف تو ارادہ اور اختیار کی صلاحیت دی اور دوسری طرف اس ارادہ و اختیار کو استعمال کرنے کے لئے بعض
 محرکات بھی فراہم کر دیئے تاکہ ارادہ و اختیار صحیح سمت میں حرکت کر سکیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-
 ”..... مگر اللہ کی حیثیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے اس وجہ سے انہوں
 نے باہم اختلاف کیا۔ پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے
 مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“ (البقرہ - ۲۵۳)

” یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم مشرک نہ کرتے۔ نہ ہمارے باپ دادا۔ بے شک

اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا.....“ (العام - ۱۲۸)

” اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آچکی، کوئی چیز اس بات سے کہ وہ ایمان لائیں۔ اور اپنے

پروردگار سے معافی مانگیں روکنے والی نہیں ہے.....“ (الحج - ۱۸ - ۵۵)

” اسی طرح ہم نے اس کو (دینی اور بدی کی) راہیں دکھلا دیں۔“ (۹۱ - ۱۰)

گویا اللہ تعالیٰ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ انسان کو بھی فرشتوں کی طرح 'ہدایت یافتہ' بنا دے یعنی وہ بُرائی پر قادر ہی نہ ہو بلکہ اس نے انسان کو یہ اختیار دیا کہ وہ اگر چاہے تو بُرائی سے اجتناب کرے اور اگر چاہے تو اسے اختیار کرے۔ اسی علت کے سبب حیات بعد الموت میں جو اب وہی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن انسان کو علم عقل، ارادہ و اختیار سے آراستہ کرنے کے بعد اور یہ یاد دہانی کرانے کے بعد کہ وہ درحقیقت ایک ذمہ دار اور ذمی شعور مخلوق ہے، جسے ان فرائض و ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جو اس کے خالق نے اس پر عائد کی ہیں، عمل کے لئے خود مختار چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کوئی پابندی ایسی نہیں لگا تاکہ انسان کسی ایک راستہ پر چلنے پر مجبور ہو۔ ارشادِ باری ہے:-

”جو صاف صاف ہدایت تمہارے پاس آچکی ہیں اگر ان کو پالینے کے بعد بھی تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانہ ہے۔ کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لئے خود سامنے آمو جو ہو اور فیصلہ کر ہی ڈالا جائے۔ آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ کے حضور میں ہونے والے ہیں“ (۲ - ۲۰۹ - ۲۱۰)

گویا قرآن انسان سے اس بات کا متنی ہے کہ وہ دلیل کھل کر سامنے آجانے کے بعد بلا جھجک اپنی قوت اختیار کا استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے سواء السبیل کا انتخاب کرے گا۔ وہ ایمان کی قدر و قیمت اسی میں سمجھتا ہے کہ بدی پر اختیار ہونے کے باوجود انسان بدی کا ارتکاب نہ کرے اور نیکی کو اختیار کرے۔ لیکن چونکہ انسان کو محدود صلاحیتیں دی گئی ہیں، اس لئے قرآن انسان کو بغیر کسی پاسان عقل کے چھوڑ دینے کا قائل نہیں ہے۔ انسان کبھی اپنے داخل کا کلی طور پر انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نقطہ نظر کسی معاملے پر بھی مکمل خارجی نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ کسی بیسرونی ہدایت اور بیرونی ذریعہ علم کا حاجت مند رہا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے عنایت کردہ نظام زندگی کو بطور ایک حل کے پیش کرتا ہے۔ یہ تصور حیات ایک ایسی متنی کا ترتیب دیا ہوا ہے، جو علیم و خبیر اور بصیر ہے۔ ہر قسم کی غرض اور خطا سے پاک ہے۔ اس لئے یہی ضابطہ حیات ایک معروضی (OBJECTIVE) معیار پر پورا آتا سکتا ہے۔

(۳)

قرآن پاک انسان کی حقیقت کائنات میں اس کے مقام اور مقصد سے بحث کرتے وقت اس

کی دنیاوی زندگی کو ایک ایسے تجرباتی احساس سے تعبیر کرتا ہے، جس کی کوئی دائمی حیثیت نہیں ہے جو محض حقیقت کا ایک سایہ اور پرتو ہے چنانچہ قرآن دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حقیقی اور ابدی زندگی کا انتہائی واضح نقشہ کھینچنے کے بعد مکرمینِ آخرت سے پوچھے جانے والے ایک سوال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے: "اس وقت اس کا رب اس سے پوچھے گا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ کہیں گے ہاں اے ہمارے رب یہ حقیقت ہی ہے..... (العام ۲۴-۲۴)"

قرآن کریم کی رو سے یہ دنیا انسان کا مستقل اور دائمی مسکن نہیں بلکہ ابدی زندگی کی تمہید ہے اور اس کی حیثیت ایک مختصر اور متعین مدت کے لئے ترتیب دی ہوئی امتحان گاہ کی سی ہے۔ اس ہیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ الدنیا منزع الآخرة دنیا آخرت کے لئے کھیتی کی حیثیت رکھتی ہے یعنی جو کچھ یہاں بوڈو گے وہاں کاٹو گے۔ قرآن انسان کو مشاہدہ محض کی دنیا سے نکال کر مشاہدہ حق کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بار بار انسان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آیاتِ الہی میں غور کرے اور پس پردہ جو حکمت کار فرما ہے، اُس کا احساس و مشاہدہ کرے۔

(۴)

قرآن میں جو تصورِ انسان دیتا ہے، وہ نہ تو معصوم کہا جاسکتا ہے اور نہ پیدائشی طور پر گنہگار ہی، بلکہ ہم اسے ایک با اختیار انسان کا تصور کہہ سکتے ہیں۔ کچھ مذاہب نے یہ تصور پیش کیا کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔ قرآن اس تصور کی تردید تخلیقِ آدم کے واقعہ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی۔ جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔ (۲-۲۷-۳۸)"

قرآن واضح طور پر تردید کرتا ہے کہ آدم کو کسی گناہ کی پاداش میں دنیا میں بھیجا گیا۔ اس موقع پر قرآن کی دوسری سورت کی اس آیت کا مفہوم ذہن میں رکھا جائے، جس میں اللہ تعالیٰ تخلیقِ آدم کے ارادہ کا اظہار فرشتوں کے سامنے فرماتا ہے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ میں جنت میں رکھنے کے لئے ایک انسان بنا رہا ہوں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ "میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اول الذکر

آیت میں واضح طور پر حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کے اعلان کے بعد انسان کے 'اولین گناہ' کا تصور باقی نہیں رہتا۔ قرآن اس بات کی بھی تردید کرتا ہے کہ حضرت آدم کو ترغیب میں حضرت حوا کا حصہ تھا بلکہ وہ ان مرد اور عورت دونوں کو مادی طور پر نفس کے بہ کائے میں آجانے والا قرار دے کر دونوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے اور ان کی جہول کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر انہیں پاک و صاف قرار دینے کے بعد زمین پر اپنے نائب کی حیثیت سے سمجھا ہے۔ گویا قرآن کسی پیدائشی گناہ کا انسان کی جگہ ایک صحت مند اور قوی ارادہ انسان کا تصور پیش کرتا ہے۔ قرآن انسان کی عظمت، گناہ نہ کرنے میں نہیں قرار دیتا بلکہ گناہ کی حیثیت کے باوجود گناہ سے دامن بچا جانے اور بصورت دیگر ندامت، غلطی کے اعتراف اور مائلی بہ اصلاح ہونے میں قرار دیتا ہے۔

قرآن انسان کی انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اس کی اجتماعی ذمہ داری کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتا ہے، قرآن کا انسان اعتقادات کو اپنا ذاتی معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ایک معاشرہ اور ایک عالم گیر راہداری کے رکن کی حیثیت سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے کمر بستہ نظر آتا ہے۔ ایمان کے کلمہ جامعہ کا اقرار کرتے ہی ایک شخص ایک طرف خدا سے جڑ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اُمت کا جزو بھی بن جاتا ہے۔ دونوں عمل بیک وقت رونما ہوتے ہیں۔ یہ اُمت صرف عقیدہ، ایمان اور اخلاق کی بنیاد پر بنتی ہے۔ یہی وہ واحد اصولی فرقہ امتیاز ہے، جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ وہ تمام انسان جو خلافتِ نبی الا رض کی ذمہ داری کو شعوری طور پر اٹھاتے ہیں، ایک اُمت بن جاتے ہیں۔ یہی اُمت وسط ہے اور وہ تمام انسان جو اس حق کا انکار کرتے ہیں، ایک دوسرے گروہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حدیثِ نبوی میں آتا ہے کہ "السکفر ملۃ واحده" قرآن کا انسان مطلوب ایک حق گو اور حق شناس ہستی ہے، جو انفرادی زندگی کے ساتھ ہی اجتماعی زندگی میں بھی اصلاح و تہذیب میں صرف نظر آتی ہے۔

(۵)

قرآن ہمیں جو تصور انسان دیتا ہے، وہ مساواتِ انسانی پر مبنی ہے۔ وہ کسی نسل کی برتری، رنگ کی تفریق یا زبان کے تعصب کو راہ نہیں دیتا، بلکہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ "لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلائے....." (النساء - ۱)

نوع انسان کی مسادات ان تمام باتوں کو پاش پاش کر دیتی ہے جنہیں ہم قومیت، وطنیت اور رنگ و نسب وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس طرح ایک باپ کی ادلاؤ آپس میں کوئی تعلق نہیں کر سکتی، بالکل اسی طرح نسل نوع انسان باہم کسی قسم کا تعلق کرنے کا حق نہیں رکھتی۔

(۶)

انسانی مسادات کے اس عالم گیر تصور کے ساتھ ہی قرآن انسان کی فطرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین فطرت کے ساتھ تخلیق کیا ہے: "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور اس کے ساتھ ہی انسان کی فطرت میں سچائی اور صداقت کی ہر آواز پر لبیک کہنے کا ایک داعیہ رکھ دیا ہے۔ یہ داعیہ حق دراصل ایک "تحت الشعوری احساس" ہے اس قدیم تجربہ کا، جو بنی نوع انسان نے ایک میثاق کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔ ملاحظہ ہو سورہ اعراف - ۱۱۶، یہی تحت الشعوری احساس ہے جو ایک سخت منکر سے منکر انسان کو بھی معصیت و آزمائش میں اللہ کا نام لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خود قرآن بے شمار مقامات پر یہ کہتا ہے کہ جب انسان سمندر میں طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو کسے مدد کے لئے پجاتا ہے۔ وغیرہ..... اسی تحت الشعوری احساس کو جگانے اور اسے ایمان کی شعوری سطح تک لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو مذکورہ یاد دلانے والا، اور ان کی دعوت کو ذکر یا تذکرہ یا تذکیر دیا، یادداشت، یاد دہانی، کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا۔ دراصل یہ تذکیر اور یاد دہانی اسی عہد نامہ کی تھی جو نوع انسانی کی ارواح کے اجتماع سے لیا گیا تھا اور یوں یہ فطری داعیہ محض ایک احساس سے آگے بڑھ کر ضابطہ حیات اور وہ بھی غیر متبدل اصولوں میں بدل جاتا ہے، جہاں ظن و گمان کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ صداقت کا یہی فطری داعیہ ہے جو انسان کے اولین گناہ کے وقت ضمیر کی پکار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن قرآن اپنے انسان مطلوب کو محض اس فطری داعیہ کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑ دیتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے "وعلی اللہ قصد السبیل ومنہا جائر....." (النحل - ۹)

یعنی "اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے موجود ہیں۔"

اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے نبوت کی ابتدا ہوتی ہے اور قرآن کا انسان مطلوب ایک آزاد و مختار حیثیت رکھنے والا، ذی شعور، ذی ہوش اور ذی ارادہ مخلوق کی حیثیت سے خلافت فی الارض

کی ذمہ داری پر ناز و نبی نوع انسانی کی عالم گیر مسادات کا دائمی اپنی رہنمائی اور رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فرمان اور فرمان بردار انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہی وہ ہمہ گیر تصور ہے جس کی غیر موجودگی یا جس کی کسی کڑی کے گم ہو جانے سے انسان اس اندھے شخص کی طرح ہو جاتا ہے جو تاریکی شب میں اندھیرے کمرے میں ایک ایسی سیاہ بلی تلاش کر رہا ہو جو وہاں موجود نہ ہو۔ ●●

تیسرے صوفیوں کی پاکستان فلسفہ کانگریس میں ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء کو سوشل اور مورال غلامی کی نشست میں پڑھا گیا۔



﴿ ہر زمانہ میں نیا ظہور ہوتا ہے اور ہر ظہور کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ ساتھ احکام بھی بدلتے ہیں۔ اور نئے نئے ترجمان حق آتے ہیں۔ منشاء الہی کا پہلا ظہور معدنیات کی صورت میں ہوا۔ معدنیات کے بعد عالم نباتی قدرتِ حق کا محور بنی۔ نباتات سے حیوانات نے یہ منصب لیا۔ اور پھر انسان کی شکل میں ارادہٴ حق کا ظہور ہوا۔ انسان اول یعنی حضرت آدم کو پیدا کر کے اُس سے خدا نے یوں خطاب کیا :-

” تو دنیا کا ایک نمونہ ہے۔ اور اس کی ایک اجمالی صورت ہے۔ تم عالمِ صغیر ہو جو عالمِ کبیر کی شبیہ ہے۔ آسمانوں۔ زمینوں اور پہاڑوں کو چھوڑ کر تمہیں امانت کا حامل بنایا گیا ہے۔ ساری دنیا تیرے لئے مسخر کی گئی ہے۔ بارش برستی ہے تو تیرے لئے، سبزہ آگتا ہے تو تیری خاطر۔ اور مال مولیٰ تیرے آرام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور تمام مخلوقات میں صرف تم میرے محبوب ہو۔“

آدم سے حق کے ترجمانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ تا آنکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ دور ختم ہوتا ہے۔

دفتہ بیات البیہ
حضرت شاہ ولی اللہ

